ڈاکٹر جمیل جالبی اور پاکستانی ثقافت

غلام عباس

ABSTRACT:

Dr Jamil Jalibi is a renouned scholar and great researcher . He has been buisy in his literary, critical and scholarly work for the last seven decades. Cultural issues remained a ponit of focus in his criticism. According to him, Islam is centra force and ,cultural history and Urdu language are also basic ingredients of pakistani culture. We got Pakistan to promote our culture without fear and pressure but unfortunately we were trapped in the idea of superiority of loacal cultures over national cultue. We ingnored basic rules of social justice that produced frustration among different groups. The only solution of these problems is revival of fundamental idealogy , unity of ideas about national culture and creative endevour to reunite the nation.

اُردو میں تہذیبی موضوعات پر تنقید کا باقاعدہ آغاز محمد حسن عسکری سے ہوتا ہے ۔ محمد حسن عسکری نے ۱۹۴۶ء میں ہی ثقافتی موضات پر لکھنا شروع کیا۔ وہ مطالبۂ پاکستان کے تہذیبی جواز کے سب سے بڑے مئوید تھے ۔ ان کے نزدیک اسلام ثقافتی اعتبار سے ایک تخلیق کے اُصول اور مسلم کلچر ایک فعال اور نامیاتی کلچر ہے ۔ اسلام جس علاقے میں گیا اس نے اپنی وضعات پیدا کی ۔ اور یوں تیرہ سوسال کی تاریخ مسلم ثقافت کے فعال اور نامیاتی ہونے کی دلیل ہے ۔اس لیے پاکستان کے نئے پن پر زور دینے کی بجائے تاریخی شعور کا مظاہرہ کرنا چاہیے، یوں تحریک پاکستان اپنے تاریخی اور تہذیبی تناظر میں ہی بامعنی ہے ۔ وہ اس معاملے میں کسی انتخابی رویے کے قائل نہیں۔ اُن کے بقول : ہماری قوم بنی بھی ہے اور بگڑی بھی ہے ۔[۱] اور عمر بن عبدالعزیز ہمارے ہیں تو واجد علی شاہ اور اور احمد شاہ رنگیلا بھی ہمارے اپنے ہیں۔ ان کے خیال میں ہمارے پاس "تہذیبی نمونوں کی کمی نہیں "[۲]اب نئے تناظر میں بروئے کار لانا ہے ۔اس معاملے میں پہلی رہنمائی اپنی تہذیبی تاریخ سے ملتی ہے جو تاریخی شعور سے حاصل

ہوتی ہے۔اس کے بعد وہ ذہنی سرگرمیوں سے وابستہ افراد کو اہم ترین گردانتے ہیں کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو نئے حالات میں تہذیبی تسلسل کو مجروح کیے بغیر قوم کو تہذیبی وضعات کی تشکیل کے لیے رہنمائی کرتے ہیں اور ان میں ادیب، دانشور اور پروفیسر وغیرہ شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے ہاں اضطراب بڑھتا ہے۔تو وہ اسی طبقے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے قومی سطح پر غداری کا ثبوت دیا ہے۔

> ''اصل کو قوم کو دھوکہ دینے والے سیاسی لیڈر نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی قسم کے ذہنی کام سے ہے۔ ہمارے ہاں ادیبوں، شاعروں اور پروفیسروں کا طبقہ وہ گروہ ہے جس کی غداری کی مثال دنیا میں تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔''[۳]

عسکری کی ان تصورات کے متوازی فکر کے کئی اور دائرے بھی موجود تھے۔ان کے خیالات نے ادبی فضا میں ایک تحرک سا پیدا کر دیا تو عمل اور ردعمل کے کئی دائرے وجود میں آئے۔ ترقی پسندوں کو سرے تہذیب کی دینی اور مابدالطبیعاتی اساس سے ہی انکار تھا۔سجاد ظہیر جیسے لوگ کہہ رہے تھے کہ:

> '': خیالات، نظریے، فلسفانہ تصورات، عقائد انسان کے ذہن میں اس کے مادی حالات زندگی اور اس کی بناء پر پیدا ہونے والے اجتماعی رشتوں اور مختلف قسم کے (سیاسی، مذہبی، تہذیب) اجتماعی سماجی عمل اور ان سے پیدا ہونے والی زندگی کے عکس ہیں۔''[۴]

خیالات اور عقیدے انسانوں کے دماغ میں خود رو ہوتے ہیں، نہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں بلکہ یہ ذرائع پیداوار مرہون منت ہیں"سویرا "ترقی پسندوں کے لیے ایک پلیٹ فارم کا کام کر رہا تھا۔ اور ممتاز حسین، ظہیر کاشمیری اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کے ہاں مابعد الطبیعاتی اصول سے انکار کا رویہ موجود تھا۔ جو اعتدال آگے چل کر احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کے ہاں نظر آتا ہے، وہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کی فضا میں ترقی پسندوں کے ہاں مفقود ہے۔ اسلامی اساس پسندوں کے لیے وہی خیالات رہنما اُصول تھے جو سید ابواعلیٰ مودودی ،'' مسئلہ قومیت'' میں پیش کر چکے تھے۔یعنی تاریخ میں مسلمانوں کی ہر کاوش کو اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے وہ کہہ چکے تھے:

> ''آپ سے جب تہذیب کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔ گویا یہ ہے اسلامی تہذیب کا سب سے نمایا نمونہ حالانکہ اسلامی تہذیب یہ سرے سے ہے ہی نہیں۔''[۵]

پروفیسر محمد عثمان، پروفیسر فروغ احمد، ماہرالقادری، نعیم صدیقی اور اس قبیل کے دیگر مفکرین کے ہاں ایسے خالص اسلام کا تصور ملتا ہے جس میں خلافتِ راشدہ کے بعد تمام اسلامی تہذیب کے بارے میں انتخابی رویہ موجود ہے "فاران "اور چراغِ راہ" جیسے رسائل کے اوراق ایسے ہی مفکرین کے لیے وقف تھے۔ترقی پسندوں کے ہاں بعد میں اسلام کو ایک تہذیبی قوت کے طور پر قبولیت کا رویہ در آیا اور فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضامین کلچر کی تشکیل میں اسلام اور اسلامی تاریخ کے کردار کو تسلیم کیا مگر اپنے علاقے کی جغرافیائی تاریخ کو زیادہ اہمیت

دی۔ ان متنوع رویوں کے درمیان ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد تھی جو اسلامی تہذیبی تاریخ کو اپنی کلچر کا توانا ماخذ اور مسلمانوں کی الگ تہذیبی شناخت کو مطالبہ پاکستان اساس سمجھتی تھی ۔ ان میں انتظار حسین، ممتاز شیریں۔ آفتاب احمد خان، ڈاکٹر سید عبداللہ، خلیفہ عبدالحکیم اور بہت سے دوسرے لوگ شامل تھے۔ ساٹھ دہائی میں ایک تو پاکستان نے آزادی کے دس بارہ برس دیکھے لیے تھے اور نوزائیدہ مملکت کے اپنے ثقافتی مسائل پیدا ہونا شروع ہو گئے علاقائی ثقافتوں پر حد سے زیادہ توجہ دی جانے لگی ۔قومی وحدت یکجہتی کا تصور ماند پڑنے لگا۔ پاکستان میں مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی جن کی جغرافیائی تاریخ اس علاقے میں نہیں تھی جس پر پاکستان قائم تھا۔ ان کے ذہنوں میں بے چینی اور صورت حال پر اضطراب نے جنم لینا شروع کر دیا۔ ایسی تشویش ہمیں بہت سے دانشوروں اور ناقدین کے ہاں بھی نظر آتی ہے ۔ اور وہ ثقافت، قومی یکجہتی اور زبان کے مسئلے پر مسلسل اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

اس پس منظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی وہ تحریں سامنے آتی ہیں جن کا تعلق کلچر کے مسائل اور خاص کر پاکستان کے ثقافتی اور قومی مسائل سے ہے ۔ اس ضمن میں ان کی اہم ترین کاوش " پاکستانی کلچر'' ہے جو ساٹھ کی دہائی میں سامنے آئی اور پھر وہ بھی مسلسل اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے رہے ۔'' نیا دور'' کے اداریوں نے علاوہ اُن کے درجنوں مضامین اور مقالات ، اخبارات و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ متعدد مضامین ، اُن کی کتب'' تنقید اور تجربہ''،'' ادب کلچر اور مسائل'' اور'' معاصر ادب'' میں مرتب ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کلچر کے مسئلے کو دو سطح پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ کلچر بنیادی طور پر کس شئے کا نام ہے اور اس کی اساس کن لوازم پر ہے۔ دوسرا یہ پاکستانی کلچر کی بنیاد کیا ہے اور اس کے مسائل ،مسائل کے اسباب اور ان کا حل کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریروں میں کلچر کی، کسی قوم کے نظامِ خیال سے گہری وابستگی کا تصور ملتا ہے ۔ یہ نظام خیال ہیں طرزِ احساس بھی پیدا کرتا ہے اور طرزِ عمل بھی۔ ہمارے نظامِ خیال کے پیچھے اسلام کے اساسی اصول کا فرما ہیں۔ ہمارا نظامِ خیال جہاں جہاں بھی گیا پہلے سے موجود ضعیف نظام کو فتح کیا اور اپنے اصولوں پر مبنی طرز عمل اور طرز احساس پیدا کیا۔ اپنے نظام خیال میں وہ روحانی تجربے کے باقی تمام عوامل پر فوقیت دیتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی:

> ''............جغرافیائی حدود میں رہ کر ہڑپہ اور موہن جوڈرو کے وہ معنی ہرگز نہیں ہیں جو حدود سے باہر رہ کر بھی ہمارے لیے کعبے کے معنی ہیں ۔ کعبہ ہمارا روحانی تجربہ ہے اسکے برخلاف موہن جوڈرو اور ہڑپہ کا ہمارے روحانی تجربے سے کوئی تعلق نہیں............ دراصل بنیادی مسئلہ تو روحانی تجربے، تاریخ اور روایت کا ہے "[٦]

جمیل جالبی کے ہاں ہمارا نظام خیال جو روحانی تجربے سے وابستہ تھا، دنیا کے جس علاقے میں بھی گیا وہاں پہلے سے موجود نظام خیال پر طاقت ور طریقے سے اثر انداز ہوا اور طرز احساس اور طرز عمل کی نئی وضعات تشکیل

دینے کے قابل ہوا۔ یہی پیٹرن اور وضعات ہمارا کلچر ہے ۔ ہمارے اسی نظام خیال نے ہماری ایک ہزار سالہ ہندوستانی تاریخ میں ثقافتی مظاہر، ادارے، فنون اور زبان پیدا کی۔ ان کے خیال میں ہمارے لیے ایک جغرافیہ اس لیے اہم کہ یہ ثقافتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ہمارجغرافیہ اورجغرافیائی تاریخ ہمارامقصداولیٰ نہیں ۔وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ارضی تہذیب کے تصور کے بالکل مخالف قطب پر موجود ہیں ۔ان کے خیال میں ہم ثقافتی سطح پر''جغرافیہ کے اندر رہتے ہوئے بھی غیر جغرافیائی''[۶۱۰] ہیں ۔ہم برصغیر کی تہذیبی تاریخ کے وارث نہیں بلکہ ہندمسلم تہذیب کے وارث ہیں۔ میں ہم برصغیر کے مسلمان جو کچھ ہیں اسی تہذیبی عمل کا نتیجہ ہیں جو ایک ہزار سال تک جاری رہا۔

> "ہم پاکستان کے سب باشندے اسی ہندومسلم ثقافت کے وارث اور جانشین ہیں جو اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت میں یہاں کی فضا، آب و ہوا اور میل جول کے زیرِ اثر پروان چڑھتی رہی۔"[۷]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں اس تہذیبی عمل میں عربوں کے مذہبی جوش وخروش اوآ درش ا کا اثر بھی شامل ہے اور افغانوں ، ایرانیوں اورترکوں کے کھانوں کے مزاج کا اثر بھی ہے ۔ جب ان سب مسلمانوں نے آ کر برصغیر پاک وہند کی روح کو بھی اپنے مزاج میں سمویا، تب جا کر تہذیب کے وہ نمونے سامنے آئے جو آج ہماری تہذیب کی بنیاد ہیں۔ وہ مقامی عناصر کو الگ شناخت کر کے پیش کرنے کے حق میں نہیں بلکہ ان کے نزدیک ان مقامی عناصر ایک ہزار سالہ صحت مند تخلیقی ثقافتی عمل کے اثرات کے بعد منقلب ہر کر ہماری تہذیب کا حصہ بن گئے ہیں۔ان کے خیال میں پاکستان بھی کوئی سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ ہندوطرز احساس کے مقابلے مین اس مسلم تہذیبی طرز احساس کی عملی شکل کا نام ہے ۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ اٹل حقیقت ہے ۔ان کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی طویل داستان بھی دو الگ الگ تہذیبوں کے طرز احساس کی داستان ہے ۔

> "''پاکستان کا وجود مروجہ محض کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ دوطرزِ ہائے احساس کی جنگ تھی، جس میں ہندوطرزِ احساس اور مسلم تہذیبی طرزِ احساس الگ الگ سورج بن کر اپنا الگ الگ نظامِ شمسی قائم رکھنا چاہتے تھے۔ہندو اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی طویل داستان دراصل جدا تہذیبی طرزِ احساس کی داستان ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو قبول کر لینا چاہیے اسی میں دونوں کی سلامتی ہے۔''[۸]

وہ پاکستان کے قیام کے محرکات میں تہذیبی محرک کو اہم ترین سمجھتے ہیں:

> "پاکستان کی تخلیق کے وجوہ یہ تھے کہ اپنی ملی شخصیت اور قومی انفرادیت کو آزادی کے ساتھ برقرار رکھ کر وحدت کے ساتھ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنا تا کہ ایسے معاشرے کو جنم دیا جا سکے جس میں ہماری روایت، ہماری تاریخ ، ہماری زندگی کی رنگا رنگی بھی موجود ہو اور جدید دور کے تقاضے بھی یعنی ترجمان ماضی بھی ہو اور شانِ حال بھی"[۹]

گویا پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا تہذیبی آدرش تھا جس میں وہ اپنے نظامِ خیال کو اپنی تاریخ اور تہذیبی روایات کی روشنی میں تخلیقی سطح پر فعال کر سکیں۔ پاکستان کا خواب جس قدر با معنی تھا تعبیر اس قدر با معنی نہ نکلی۔ ساٹھ کی دہائی اور اس کے بعد ان کے ہاں کئی سطح پر تشویش اور اضطراب ملتا ہے وہ کہتے ہیں: ہم نے اجتماعی جدو جہد کے ذریعے پاکستان کو جغرافیائی وجود دیا مگر تاریخی شعور پر اس کی فکری بنیادیں استوار نہ کر سکے"[۱۰] ان کے خیال میں اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم جموداور انفعال کا شکار ہوئے اور نظام خیال کے ارتقاء میں مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ ہمارا نظام ان روحانی اصولوں پر قائم ہے جن کے اندر بدلے ہوئے حالات کے مطابق تاریخ اور روایت کی روشنی میں نیا انداز اختیار کرنے کی طاقت ہے۔ ہر کلچر کے خیالات و افکار کا نظام جب ایک نسل سے اگلی نسل تک پہنچتا ہے تو اس میں فرسودگی اور ابہام پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کو جب تک از سرِ نو مرتب نہ کیا جائے اس میں نئے مسائل کو حل کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارے کلچر کے اندر سے تخلیقی روح ختم ہر گئی ہے اور ہمارا کلچر محض معمول، عادت اور رسوم اور رواج کی شکل اختیار کر گیا ہے لکھتے، ہیں:

> ''کلچر کے زوال کے دو اسباب ہیں اولاً یہ کہ معاشرے میں خیال کے ارتقاء کا بند ہو جانا اور ثانیا یہ کہ کلچر کے نظام کا صرف معمول یا عادت بن کر ظاہری رسوم و رواج میں مقید ہو کر بے روح ہو جانا"[۱۱]

ان کے نزدیک قیام پاکستان کے بعد پاکستانی بھرپور سطح پر تہذیبی اظہار کرنے کی بجائے ایک تہذیبی خلا کی طرف چلے گئے۔ اس خلا میں اپنی تہذیب یعنی اپنے آدرش کی تکمیل کی بجائے ہم دوسروں کی تہذیبوں کی طرف دیکھنے لگے۔ نظام خیال میں جمود خارجی سطح پر بے عملی نے ہمیں ثقافتی کرائسس میں لا پھینکا جس میں ہم باعمل ثقافتوں کے مقابلے میں بے بس اور شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس تہذیبی خلا کی وجہ سے ہم ایک طرف تو یورپ سے لباس، آداب معاشرت، تعمیرات، فنون لطیفہ، مادی ترقی اور اخلاقی ضابطوں کی سطح پر شکست کھا رہے ہیں تو دوسری طرف ہمارے ذہنوں پر بدحالی اور پسپائیت کی دھند کے دبیز پردے پڑ رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ہم اس خزاں رسیدہ درخت کی مانند ہوتے جا رہے ہیں، جس کے سب پتے جھڑ گئے ہوں اور وہ لنڈ منڈ تنہا کھڑا ہو۔ معاشرے میں اب کوئی چیز اپنی اصل شکل میں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہے اور جو چیز اصل ہے وہ نظر نہیں آتی۔ یہ تضاد کا دوسرا رخ ہے۔ جب زندگی یہ شکل اختیار کر لے تو معاشرے کا عام فرد دیکھنے کا کام ہی بند کر دیتا ہے۔'' [۱۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں ذہنی انفعال اور پسپائی اقوام کو ثقافتی سطح پر مردہ کر دیتے ہیں۔ ارتقائے خیال کا رک جانا تہذیبی ارتقا کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اور ہماری حالت یہ ہوگئی کہ ہم نے تہذیبی تشکیل نو کے لیے ملک تو آزاد کرا لیا لیکن تشکیل نو کے فکری اور عملی مطالبات بہت جلد بھول گئے۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر ان کے ہاں جگہ جگہ تشویش نظر آتی ہے۔ پاکستان کی تخلیق کے وجوہ یہ تھے کہ اپنی ملی شخصیت وقومی انفرادیت کو آزادی کے ساتھ برقرار رکھ

کر وحدت کے ساتھ اپنے وجود کو قائم رکھنا، لیکن پاکستانیوں نے یہی نکتہ بھلا رکھا ہے۔ جہاں ارتقائے فکر کے انجماد اور ثقافت کی تخلیقی جہت منہا ہونے پر مضطرب نظر آتے ہیں، وہیں وہ قومی یکجہتی کے بارے میں کئی معاملات پر متفکر ہیں۔ ان کے خیال میں پاکستان میں ثقافتوں کی رنگا رنگی ایسی ہے کہ ہر کوس پر رنگ مختلف اور دس کوس پر رنگ بدل جاتا ہے مگر یہ اختلاف ماحول کے اثرات کی وجہ سے ظاہری سطح پر ہے۔ ان کے خیال میں قومی کلچر اور علاقائی کلچر میں لاکھ اختلاف کے باصف ہر دور کی اساس ایک ہے۔ یعنی وہ ایک ہی مابعدلطبیعات سے وابستہ ہیں اور زندگی کے خارجی تنوع کی بنیاد مشترک ہے۔ لہذا اس ورثے کو انتشار اور دوری پیدا کرنے کی بجائے اتحاد یکجہتی کا ذریعہ بنانے کی ضرورت ہے ان کے خیال میں لاکھ تنوع کے باوجود:

"پاکستان ایک قوم کا باطن ہے جس کا ایک مشترک مذہب (اسلام) ایک مشترک زبان (اُردو) ایک مشترکہ تاریخ اور ایک مشترکہ قومی کلچر ہے"[۱۳]

ان کے نزدیک پاکستان کی تہذیبی اساس میں مذہب اہم ترین عنصر ہے۔ مشترکہ تاریخ سے مراد وہ تاریخ جو ہندوستان میں ہندمسلم ثقافت کی ہے اور ہندوستان کے باہر ان عناصر کی جو کسی نہ کسی سطح پر مثبت انداز میں ہماری ثقافت پر اثرانداز ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے دو امور پر بہت واضح نقطہء نظر سامنے آتا ہے۔ ایک تو ہماری تہذیب کی اساس مذہب اور اسلامی ثقافتی تاریخ پر ہے۔ دوسرے اس وقت پاکستانی ثقافت میں انتشار موجود ہے۔ ان کے خیال میں ہمارا مسئلہ یہ ہیکہ ''ہمارے اندر ایک قوم بننے کی خواہش تو ضرور موجود ہے لیکن ہمارے سارے علاقے الگ الگ تہذیبی وحدتوں کی شکل میں زیادہ متحد ہیں''[۱۴][پاکستانی کلچر، کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۱، ص: ۶۵

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم بحثیت فرد، بحثیت علاقہ، اپنی اپنی ذات اور دائرے کے حدود سے اوپر اُٹھتے مگر ہم نے ایسا نہ کیا، ہماری حالت یہ ہے:

''علاقائی تہذیبیں طاقتور ہیں مگر ان کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں اور یہ متحد نہیں۔ عدم اعتماد قومی سوچ کا فقدان، ظلم نا انصافی، علاقائی تعصّبات اور تنگ نظری، نفاق ہمارا حقیقی دشمن ہے"[۱۵]

واضح رہے کہ ستر کی دہائی میں کچھ دانشور پاکستان کے جغرافیے کی ثقافتی تاریخ پر زور دینے لگے تھے۔ اس میں وہ یہ بات بھی نظرانداز کر دیتے کہ پاکستان میں بہت بڑی تعداد ان مہاجرین کی ہے جن کی تاریخ ان جغرافیائی علاقوں میں ماضی کا سفر طے نہیں کرتی، جن علاقوں پر آج پاکستان مشتمل ہے اس لیے مقامی اکائیوں اور مہاجرین نے مل کر کوئی مشترکہ ثقافتی نمونے تیار کرنے تھے تو اس کی اساس لازماً کسی روحانی اصول پر ہونا تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کو اس امر پر شدید تشویش ہے کہ بحیثیتِ قوم ہم نے پاکستان کے ثقافتی مسائل کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں اس کی بھاری قیمت ادا کر چکا ہے۔ اس کا اصل سبب یہی تھا کہ قیام پاکستان کے بعد علاقائی کلچر طاقتور ہوتا گیا اور قومی کلچر کمزور۔ قومی سطح پر ہم نے مثبت اندازفکر نہ اپنایا اور "جغرافیہ اہم ہو گیا، تاریخ غائب ہو گئی۔"[۱۶] یوں جڑنے کے عمل کی بجائے ٹوٹنے کا عمل شروع ہوا اور ۱۹۷۱ء کے سانحے سے بھی ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا اور "قومی یکجہتی کے مسئلے کو التوا میں ڈال کر ہم طفلانہ خوش فہمی کا شکار ہیں"[۱۷] جہاں وہ

علاقائی کلچر کے لیے لازم گردانتے ہیں کہ وہ قومی کلچر کو نمو دے، وہاں وہ قومی سطح پر ہر شعبے میں انصاف کی عمل داری کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی بھی سطح پر کوئی مقتدر قوت یا طاقتور گروہ علاقائی ثقافتوں کے ساتھ نا انصافی کرتا ہے تو اس کے ردعمل میں ایسے رویے پیدا ہوتے ہیں جو قومی یکجہتی کو مجروح کرتے ہیں۔ اس لیے:

"انصاف اور صرف انصاف زندگی کی ہر سطح پر انصاف قومی یکجہتی اور تہذیبی و سیاسی اداروں کی نشوونما کے لیے ایسا ضروری ہے جیسا سانس کی آمدورفت انسانی زندگی کے لیے "[۱۸]

جمیل جالبی کو جہاں اس امر کا احساس تھا کہ آزاد ملک حاصل کرنے کے بعد ہم ثقافتی محاذ پر کمزوری کا مظاہرہ کیا اور نظامِ خیال کو از سرِ نو مرتب نہ کیا۔ وہاں اس خطرے سے بھی آگاہ ہیں کہ اس بوسیدگی کی صورت حال میں خارج سے کوئی بھی تہذیبی یلغار بطور خاص مغرب کی تہذیب کی اندھا دھند پیروی تہذیبی شخصیت کے لیے سم قاتل ہوگی:

"ہر نظریہ اپنا نظامِ خیال ساتھ لے کر آتا ہے اور اپنے تہذیبی معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی ادارے خود بناتا ہے اپنے علوم خود پیدا کرتا ہے جن کے زیرِ اثر نئی نسل پروان چڑھتی ہے .... ہمارے اہلِ دانش کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا تخیل اس کے دائرے میں ہے۔ ہمارے تہذیبی، معاشرتی سیاسی ادرے مغرب کی صورت پر پیدا ہو رہے ہیں۔ ہماری کئی نسلیں مغرب کے زیرِ اثر بڑھ کر تیار ہوئی ہیں ایسے میں نظریہ اور مملکت کے رشتوں پر غور کرنے والوں کو اس صورت حال کا بغور جائزہ لے کر اس مسئلے پر نہایت توجہ سے غور کرنے کی ضرورت ہے'[۱۹]

جمیل جالبی گزشتہ نصف صدی سے پاکستان کے تہذیبی مسائل پر جو سوال اُٹھا رہے ہیں وہ آج بھی اتنے ہی متعلق ہیں جتنے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں تھے۔ بات ختم کرنے سے پہلے انہیں دُہرا لیا جائے تو یقیناً آج کے تہذیبی بحران میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں:

۱۔ کہیں ہم اس ثقافتی جواز کو بھول تو نہیں گئے جو قیامِ پاکستان کا سبب بنا؟

۲۔ کہیں ہمارے نظامِ خیال میں فرسودگی اور انحطاط تو واقع نہیں ہو گیا؟

۳۔ کہیں ہم اپنی ثقافت کے روحانی پہلو کو نظر انداز کر کے اس کے مادی، جغرافیائی یا کسی اور پہلو پر تو زور نہیں دینے لگے؟

۴۔ کہیں ہم اپنی ثقافتی تاریخ اور روایات کو فراموش تو نہیں کر بیٹھے؟

۵۔ کہیں ہمارے ثقافتی نمونے تخلیقی روح سے عاری ہو کر جامد تو نہیں ہو گئے؟

۶۔ کہیں ہمارے نظامِ خیال کو مغرب کا یا کسی اور ثقافت کا نظامِ خیال فتح تو نہیں کرنے لگا؟

۷۔ کہیں ہم ذیلی ثقافتوں کے حصار میں اس طرح مقید تو نہیں ہو گئے کہ ہماری قومی ثقافت نظروں سے اوجھل ہو گئی ہو؟

۸۔ کہیں ہم ناانصافی کی ایسی راہ پر تو نہیں چل نکلے کہ کچھ ذیلی شناختوں میں احساس محرومی پیدا ہو جائے؟

تحریر کے آخر میں موضوع کو سوالات کی شکل اس لیے دی گئی ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریروں میں یہ مقصد نمایاں نظر آتا ہے کہ پاکستانی قوم کے ذہنوں میں کلچر اور پاکستانی کلچر کے بارے میں شعوری تفکر کو زندہ رکھا جائے اور وہ جس حالت میں بھی ہیں ،قومی ثقافت کے بارے میں یہ سوالات گم نہ ہونے پائیں ۔یہ ممکن ہوا تو کبھی نہ کبھی قوم ان کے جواب بھی ڈھونڈ لے گی ۔

حوالہ جات:

(۱) عسکری،محمد حسن، تخلیقی علم اور اسلوب،کراچی ،نفیس اکیڈمی ، ۱۹۸۹ء،ص:۲

(۲) ایضاً ، ص۲۰

(۳) عسکری،محمد حسن،جھلکیاں، (حصہ اول) لاہور، مکتبہ الروایت ، ۱۹۸۱ء،ص ۲۲۶

(۴) سجاد ظہیر، روشنائی ،کراچی، مکتبہ دانیال (تصحیح شدہ ایڈیشن) ص ۱۹۷۶ء،ص:۱۷۶۔۱۷۷

(۵) مودودی، ابوالاعلیٰ،۔مسئلہ قومیت، لاہور، اسلامی پبلی کیشنز (بار دہم) جون ۱۹۷۸ء،ص ۱۸۶

(۶) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر ،کراچی ،ایلیٹ بکس،۱۹۶۹ء،ص: ۷۵

(۷) ایضاً،ص ۷۵

(۸) جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، لاہور یونیورسل بکس ۱۹۶۷ء،ص:۱۲۱

(۹) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل ،کراچی ،رائل بک کمپنی ،۱۹۸۶ء

(۱۰) ایضاً ، ص۲۹۵

(۱۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر،ص۵۳

(۱۲) ایضاً ، ص:۱۹۔۱۸

(۱۳) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل،ص ۳۳۰

(۱۴) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر،ص:۶۵

(۱۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل ،ص ۲۹۶

(۱۶) ایضاً،،ص ۲۹۶

(۱۷) جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء،ص ۱۷۷

(۱۸) ایضاً،،ص ۱۷۸

(۱۹) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل ،ص۳۴۴

کتابیات :

(۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل ، رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۸۶ء

(۲) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ایلیٹ بکس کراچی ۱۹۶۹ء

(۳) جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، یونی ورسل بکس، لاہور، ۱۹۶۷ء
(۴) جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
(۵) روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء
(۵) سجاد ظہیر، روشنائی، مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۷۶ء
(۶) عسکری محمد حسن، تخلیقی عمل اور اسلوب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء
(۷) عسکری، محمد حسن، جھلکیاں، (حصہ اول) مکتبہ الروایت لاہور ۱۹۸۱ء
(۸) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، مسئلہ قومیت، اسلامی پبلی کیشنز لاہور (بار دہم) جون ۱۹۷۸ء